"اور تم جانتی ہو کہ میں اس چاہت میں شریک نہیں ہوں.. یہ یک طرفہ ہے.."

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے.."

"اور میں مرزا صاحب جیسا نہیں ہوں.."

وہ یکدم ٹھٹک گئی.. رنجیدہ ہو گئی جیسے اُسے شدید دُکھ ہوا ہو کہ اُس نے یہ حوالہ کیوں دیا تھا..

"اس سے بھی کیا فرق پڑتا ہے.."

وہ آج صدق دل سے جو مصمم فیصلہ کر کے آیا تھا .. قطعی اور آخری.. وہ بہر حال اُسے سنانا تھا".. جیسے تمہاری کانونٹ کی انگریزی میں ایک اظہار ہے کہ .. جب تک یہ سلسلہ چلا یہ بہت خوبصورت تھا.. لیکن بہر طور اسے کہیں نہ کہیں.. کسی ایک وقت میں پہنچ کر ختم ہونا ہوتا ہے.. تم مجھے فون کر سکتی ہو.. لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب گنجائش باقی نہیں رہی.. ان بے جواز ملاقاتوں کا اختتام ہونا چاہئے.. میں آئندہ تم سے نہیں مل سکتا."

"لیکن کیوں.. کیوں.." وہ پچھلے ایک گھنٹے سے آنکھیں خشک لئے بیٹھی تھی جو ایک ریکارڈ تھا.. لیکن کیوں.. کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے جھرنے بہنے لگے.. وہ بے تحاشا رونے لگی "لیکن کیوں؟"

"ہر تعلق کی.. ایک جاندار کی طرح.. ایک عمر متعین ہوتی ہے.. اور ہمارے تعلق کی عمر پوری ہو چکی ہے.. میں کتنی دیر تک خلا میں رہ سکتا ہوں.. میں تمہارا نام تک نہیں جانتا.. یہ نہیں جانتا کہ مرزا صاحب اور اپنی اولاد کے بارے میں جو قصے تم سناتی ہو اُن میں حقیقت ہے یا وہ بالکل فرضی ہیں. مجھے نہیں معلوم کہ جس روز تم مجھ سے ملنے آتی ہو وہ ذہنی طور پر معذور لوگوں کے ادارے میں چھٹی کا دن ہوتا ہے.. مجھے کچھ بھی علم نہیں."

"لیکن کیوں.." اُس نے کچھ دھیان نہ دیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے..

"اس لئے بھی کہ تم نے مجھے ایک داشتہ کے طور پر رکھا ہوا ہے ڈیم اٹ.. جب بھی تمہیں فرصت ہوتی ہے' تمہارا دل چاہتا ہے.. تمہارے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا.. تمہارے اندر ایک اُمنگ پیدا ہوتی ہے تو تم مجھے اپنے رکھیل کو ملنے کے لئے آجاتی ہو.. تم نے واقعی مجھے اُسی طرح ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے جس کی تم خواہش رکھتی تھیں.. تم اس کا قفل کھولتی ہو' مجھے گلے لگا کر اپنی مجنونانہ محبت کا اظہار کرتی ہو اور روتی ہوئی آنسو بہاتی پھر سے

قفل لگا کر چابی اپنے بیگ میں ڈال کر واپس چلی جاتی ہو... اور اس سارے تماشے میں میرا کوئی اختیار نہیں.. میں اپنی مرضی سے تمہیں فون کر کے اگر میرا جی چاہے تو تم سے ملنے کی خواہش نہیں کر سکتا.. اور میں تمہیں مخاطب کرتا ہوں تو ایک بے جان شے کی طرح.. جیسے ایک جھاڑی کو. گھاس کے ایک تنکے کو مخاطب کرتے ہیں.. کہ میں تمہارا نام تک نہیں جانتا..."

وہ سہمی ہوئی بیٹھی رہی..

اُس کا گریہ موقوف ہو چکا تھا..

گھر لوٹنے سے پیشتر کا آخری سگرٹ کار کی ایش ٹرے میں کب کا مسلا جا چکا تھا..

زیرو پوائنٹ کی بلندی اور اس کی جھاڑیاں اور گھاس اور چٹان سب کے سب تاریکی میں روپوش ہو چکے تھے اور وہ جانور اور رینگنے والے جو زیر زمین تھے منتظر تھے کہ کب وہ کار جو کسی ایک روز اُن کی چھت پر آ ٹھہرتی تھی اور تاریکی اُترنے تک ٹھہری رہتی تھی اُس کا انجن سٹارٹ ہو.. اُن کے اوپر مٹی اور سنگریزوں کا جو سہارا ہے اُس میں لرزش پیدا کرے اور رخصت ہو جائے اور وہ اپنے تاریک سکوت میں اطمینان سے نیند کر سکیں..

خاور نے جب یہ کہا کہ.. میں تمہارا نام بھی نہیں جانتا.. تو اُس کی آواز اتنی بلند تھی کہ وہ کار کے فرش میں سے ہوتی ہوئی مٹی اور سنگریزوں میں سے سرائیت کرتی اُن تک بھی پہنچی جو اپنے تاریک سکوت کی واپسی کے منتظر تھے..

سہمی ہوئی ایک موقوف گریے کے ساتھ اُس نے اپنی غلافی آنکھیں جھپکا کر کہا "تم نے مارلن برینڈو کی فلم "لاسٹ ٹینگو اِن پیرس" دیکھی ہے؟" جیسے وہ اپنے کانونٹ لہجے میں ٹماٹو کو ٹمیٹو کہتی تھی ایسے اُس نے برانڈو کو برینڈو کہا...

"ہاں..."

"پیرس میں.. ایک خالی اپارٹمنٹ میں.. فرنیچر... پردوں.. قالینوں وغیرہ سے میرا بات کرنے سے آوازوں کے گونجتے ہوئے خالی اپارٹمنٹ میں.. برینڈو کی ملاقات اتفاقاً ایک ایسی لڑکی سے ہو جاتی ہے جو اُس کی مانند اپنی رہائش کے لئے ایک اپارٹمنٹ دیکھنے کے لئے آتی ہے..... وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے.. آمنے سامنے ہوتے ہیں.. ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک نوجوان عورت... اور اُن کے درمیان اُس خالی پن اور گونجتی تنہائی میں.. اپارٹمنٹ بلڈنگ کی تیسویں منزل پر جہاں کوئی بستر نہیں.. صرف ننگا فرش ہے، جنسی رشتہ

قائم ہو جاتا ہے.. پھر وہ اُس خالی اپارٹمنٹ میں ملنے لگتے ہیں... جیسے ہم اس الگ اور تنہا مقام پر ملتے ہیں... فلم کے آخر میں بریڈ و مر جاتا ہے تو پولیس اُس لڑکی سے پوچھتی ہے... کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟... تو وہ کہتی ہے... میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتی..." وہ چپ ہو گئی..

کار کے باہر گھنا اندھیرا اُترا ہوا تھا اور زیرِ زمین رینگنے والے منتظر تھے..

"جب میں مر جاؤں گی تو تم بھی یہ کہہ سکتے ہو کہ... میں تو اس عورت کا نام بھی نہیں جانتا.."

وہ اُس عورت کا نام بھی نہیں جانتا تھا جو ہر بار جب بورڈنگ کارڈ کاؤنٹر کے آگے کھڑے ٹکٹ تھامے ہوئے مسافر ایک قدم آگے رکھتے تھے تو وہ ہر بار اُس کی پشت سے آلگتی تھی اور لگی رہتی تھی.. وہ اس بے موقع اور بے خواہش رفاقت سے خوش نہ تھا..

وہ ایک مرتبہ پھر اپنی من مرضی سے آگئی تھی.. پرس میں سے چابی نکال کر کوٹھڑی کا قفل کھول کر اندر آگئی تھی اور اُس کی کمر میں کچوکے دیتی تھی کہ اُٹھو قیدی میں ملاقات کے لئے آئی ہوں.. بارہ کہو کے زیرو پوائنٹ کی حد تک تو ٹھیک تھا کہ وہاں ایک الگ تھلگ روپوشی تھی.. لیکن یہاں ایئرپورٹ کی گہما گہمی اور بھیڑ میں... خلقت کے اژدہام میں جب وہ دیر تک اُس کی پشت سے لگی رہتی تھی تو کسی نہ کسی کو تو احساس ہوتا ہو گا.. کہ یہ جانی بوجھی قربت دو اجنبی مسافروں کے درمیان نہیں ہو سکتی.. یہ خیال اُسے بے آرام کرتا تھا.. اگرچہ وہ بدحواسی کی حد تک احتیاط پسند ہو چکی تھی' اپنے آپ کو ہمیشہ لمبی چادر میں لپیٹ کر گوگلز چڑھا کر آتی تھی لیکن آج معاملہ بالکل مختلف تھا.. شائد وہ اپنے بیٹے کے واسطے سے ایک جواز پیدا کر چکی تھی اس لئے وہ بے خطر ہو چکی تھی..

اُس نے ابھی تک اُس سے کلام نہیں کیا تھا..

پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا..

اُسے خدشہ تھا کہ وہ اپنی اس آزادی کی خوشی میں اُس کے مڑتے ہی اپنی باہیں اُس کے گلے میں ڈال کر اُسے چومنے لگے گی.. اُس سے کچھ بعید نہ تھا..

جس عورت کا آپ نام بھی نہ جانتے ہوں اُس سے کیا بعید ہو سکتا ہے..

خاور کے آگے صرف دو مسافر رہ گئے تھے..

ایک کاؤنٹر ڈنگ کارڈ بن رہا تھا اور وہ اپنے ہینڈ بیگ کے سٹریپ پر ٹیگ باندھ رہا تھا اور دوسرا شخص اُس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور اپنے ٹکٹ کو غور سے دیکھتا ایک بار پھر فلائٹ نمبر کا تعین کر رہا تھا۔

خاور نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں وہ چپ رہے گا۔ لیکن جہاز کے اندر داخل ہوتے ہی نشست پر بیٹھتے ہی وہ اپنے غصے اور ناپسندیدگی کا بند کھول دے گا۔

"اوہ انکل..." ایئرپورٹ ہال کی بھیڑ کو بے تابی سے چیرتی ہوئی اپنے شیر خوار بچے کو سینے سے لگائے فرزانہ بیگ... اپنے پہلے بچے کو پیدا کر لینے کے فخر سے دمکتے چہرے کے ساتھ وہ بورڈنگ کارڈ کے حصول کے لئے آہستگی سے رینگتی قطار کی جانب۔ اُس کو نظر میں رکھتی لپکتی ہوئی آئی "اوہ انکل جی۔ آپ بھی اسی فلائٹ پر جا رہے ہیں؟"

اُس کا دم رُک گیا۔

"جی بیٹے۔" خاور نے بازو اٹھایا تو وہ اپنی نوخیز چلبلاہٹ سے بھری مسرت میں سیدھی اُس کے سینے سے آلگی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ بچہ بے آرام نہ ہو۔

"تو پھر ہم اکٹھے بیٹھیں گے۔ مومن بہت تنگ کرتا ہے فلائٹ کے دوران... ہاں میں نے اس کا نام مومن رکھا ہے۔ اچھا نام ہے ناں۔ باسط کو تو شرجیل پسند تھا لیکن میں نے کہا باسط یہ کوئی نام ہے لگتا ہے کسی شرارتی جھیل کا نام ہے۔" وہ بے تحاشا ہنسنے لگی اور اُسے قطعی احساس نہ تھا کہ آس پاس ایک ہجوم ہے۔ اُس کی طرح جو اُس کی پشت سے لگی کھڑی تھی اُسے بھی ایئرپورٹ کی بھیڑ کی کوئی پروا نہ تھی وہ اپنے انکل جی کو سپاٹ کر لینے کی خوشی میں سرشار تھی "اور جب میں نے مومن بجسٹ کیا تو باسط نے بہت مزاق اُڑایا' کہنے لگا یہ تو شیخ سعدی کے پھوپھا کا نام ہو سکتا ہے۔ نام کے ساتھ داڑھی بھی آجاتی ہے۔ بھلا اتنا سا بچہ اگر مومن ہو جائے تو بے تیغ کیسے لڑے گا۔ اچھا نام ہے ناں انکل جی؟"

"جی بیٹے۔ زبردست۔"

"بس ٹیک آف کرتے ہی بھاں بھاں رونے لگتا ہے اور سب مسافر مجھے بری طرح گھورتے ہیں۔ چپ ہی نہیں ہوتا۔ تھینک گاڈ آپ بھی اسی فلائٹ پر جا رہے ہیں۔ اسے سنبھال لیں گے ناں؟"

اُسی لمحے دوسرا مسافر کاؤنٹر سے الگ ہوا تو وہ ذرا آگے ہوا اور وہ اُسی کی پشت سے

پھر جان بوجھ کر آگئی بلکہ ایسے لگی جیسے دھکیل رہی ہو۔

"ضرور ضرور.. کیوں نہیں.. تمہارا ٹکٹ کہاں ہے.. ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں گے"

"تم میرے ساتھ بیٹھو گے.."

خاور نے چونک کر پیچھے دیکھا کیونکہ فرزانہ کی چلبلاہٹ میں وہ اُس کی موجودگی کو کسی حد تک بھول چکا تھا لیکن اُس نے اِس "تم میرے ساتھ بیٹھو گے.." کی تقریباً ہسٹریائی آواز میں اُسے یاد دلا دیا تھا کہ وہ ہے.. اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور چہرہ ہائی بلڈ پریشر کے کسی مریض کی مانند بے طرح سرخ ہو رہا تھا.. اور ہونٹ کپکپا رہے تھے..

اُسے بہت شتابی سے سوچنا تھا کہ اب اُسے کیا کہنا ہے.. گفتگو کی روانی میں ذرا سا وقفہ صورت حال کو مخدوش بنا سکتا تھا.. "فرزانہ بیٹے.. یہ... میرے ایک دوست کی بیگم صاحبہ ہیں... یہ بھی کراچی جا رہی ہیں اپنا چیک اپ کروانے.. تو... فلائٹ کے دوران یہ بھی نروس ہو جاتی ہیں تو... ہم تینوں ایک ساتھ بیٹھ جائیں گے.."

"ہیلو..." فرزانہ نے انکل جی کے پیچھے کھڑی عورت کو پہلی بار دیکھا..

عورت رو رہی تھی اور اُس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا..

عورت آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی صدر رہی ہو یا اُپلے تھاپنے والی ہو.. کچی عمر کی ہو یا پک کر گلنے سڑنے کے قریب ہو.. ہر عورت کے اندر قدرت کی جانب سے ایک ایسا ریڈار نصب ہوتا ہے جس کی حرکت کرتی سوئی تبھی جب ایک اور عورت آتی ہے جو ایک مرد کی قربت میں ہو اور وہ مرد اُس کے لئے محض ایک مرد نہ ہو تو ریڈار سکرین پر خدشے کی بیپ بیپ بار بار روشن ہونے لگتی ہے..

یہ غلافی آنکھوں والی عورت محض انکل جی کے ایک دوست کی بیگم صاحبہ نہ تھیں..

فرزانہ کی ریڈار سکرین پر جو بیپ بیپ بار بار روشن ہو رہی تھی وہ خاور کے ادراک پر بھی دستکیں دیتی تھیں..

"ہیلو مومن.." اُس نے بظاہر لاپروائی سے بچے کے گال تھپکے "ذرا گرینڈ ڈیڈ کو ایک سمائل تو دو... بھئی فرزانہ یہ مومن تو بہت ہی مومن ہے.. بالکل نہیں مسکراتا.." پھر اُس نے کانپتے ہاتھوں سے بچے کے لب چھوئے.. اور اُس لمحے اُس کے اندر کا سارا نظام اتھل

پتھل ہو رہا تھا اور وہ شدید تناؤ کی کیفیت میں تھا۔۔

فرزانہ اُس کے عزیز ترین اور بچپن کے دوست کی بیٹی تھی۔۔ اُس نے اُسے ایک پرائیویٹ اور مہنگے کلنک کے بے بی کاٹ میں جب پہلی بار دیکھا تھا تو وہ اس مومن سے بھی چھوٹی تھی لیکن لبوں کو ذرا سا بھی چھو دینے سے مسکرانے لگتی تھی۔۔ بیج بونے اور اُس پر کھاد بکھیرنے کا عمل تو وہی تھا جو ہمیشہ سے چلا آتا ہے لیکن مٹی میں سے جو پہلی کونپل پھوٹی تھی وہ اُس کا چشم دید گواہ تھا۔۔ پھر اُس کے پتے نمودار ہوئے اور اُس کی نظروں کے سامنے وہ پلی بڑھی اور یہ پہلا پھول جو مومن تھا اُس کی ٹہنی پر کھلا۔۔ وہ اکثر چھٹی کے روز اسلام آباد سے اُس کے گھر آجاتی تھی اور اپنے خاوند کے ہمراہ جو اُس کی چلبلاہٹ سے بہت عاجز آیا ہوا تھا اگرچہ بیوی ہونے کے باوجود اُس سے شدید محبت کرتا تھا۔۔ پورا دن اس کے ہاں بسر کرتی تھی۔۔ اُس کی پسند یدہ ڈشیں گھر سے تیار کر کے ساتھ لاتی تھی اور فریج میں رکھ دیتی تھی اور گھر کی ہر شے کو ایک آڈٹ اکاؤنٹینٹ کی طرح چیک کرتی تھی۔۔۔ انکل جی آپ کا شیونگ فوم ختم ہو چکا ہے۔۔ ٹوتھ پیسٹ کی پچکی ہوئی ٹیوب میں سے آپ برش کرنے کے لئے کیسے مزید پیسٹ نکال لیتے ہیں۔ تکیوں کے غلاف تبدیل نہیں ہوئے۔۔ میں کر کے جاؤں گی۔۔ اور پھر انکل جی۔۔۔ آپ یوں بارہ کہو کے اس ویرانے میں تنہا کیسے رہ لیتے ہیں۔۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔۔ میری نظر میں کانونٹ کی ایک ٹیچر ہیں۔۔ بہت ہی پیاری۔۔ اُن کی بھی شادی نہیں ہو سکی۔۔ تو انکل جی۔۔۔"

اُس کی نشست کھڑکی کے ساتھ تھی۔۔

خاور درمیان میں تھا۔۔

اور فرزانہ راہداری کی جانب والی نشست پر بیٹھی بظاہر مومن میں مصروف تھی۔

لیکن اُس کے اندر ایک عورت کا حسی نظام مسلسل ٹک ٹک کرتا چل رہا تھا۔۔۔ وہ ایک بچی سے ایک شادی شدہ عورت۔۔ اور ایک بچے کی ماں بن چکی تھی اور وہ دیکھ سکتی تھی کہ یہ عورت جو بورڈنگ کارڈز حاصل کرنے والوں کی قطار میں انکل جی کی پشت سے لگی کھڑی تھی تو کچھ زیادہ ہی لگ کر کھڑی تھی۔۔ اور جب انکل جی کو دیکھتی تھی۔۔ اینڈ مائی گاڈ شی ہیز بیوٹی فل ہیزل آئیز۔۔۔ عجیب بنفشی سی بھری بھری آنکھیں ہیں۔۔ تو ایسے تو ہرگز نہیں دیکھتی تھی جیسے ایک عزیز دوست کی بیوی دیکھتی ہے۔۔ کسی اور طرح دیکھتی تھی۔۔

وہ دم رو کے درمیان کی نشست پر بیٹھا تھا۔۔

ایئر ہوسٹس ٹیک آف سے پیشتر آکسیجن ماسک اور ایمرجنسی کی صورت میں نکلنے کے راستوں کی نشاندہی رٹے رٹائے جملوں سے کرتی ایک پتھریلی مسکراہٹ سے اشارے کرتی ہوئی بتا رہی تھی اور وہ دم روکے اس ناپسندیدہ اور غیر متوقع صورت حال کے سناٹے میں آیا ہوا بیٹھا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک آکسیجن ماسک اُس کے سامنے آگرے اور وہ اُس میں سانس لے سکے.. اپنے آپ کو پوشیدہ کر لے..

وہ شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان میں پھنس جانے والی ایک کشتی کی طرح تھا..

شیطان کھڑکی سے ناک لگائے... جب کہ جہاز نے ٹیک آف کے لئے رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا تھا.. بظاہر بے دھیانی اور لاپروائی میں ٹریک پر کھڑے اُن غیر ملکی جہازوں کو دیکھتا تھا جو لینڈ کر چکے تھے یا اُن کے بعد اُڑنے کے لئے اپنی باری کے انتظار میں تھے..

اور نیلا سمندر... راہداری کی نشست پر اپنے مومن میں مگن.. بظاہر مگن.. گہرا اور پرسکون تھا.. اگرچہ اندر ہی اندر شک شبہے کے تلاطم میں تھا..

واقعی جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی مومن نے صبر کا دامن چھوڑا اور اپنے بالشت بھر وجود سے کہیں توانا اور دلدوز ہوں آں ہوں آں بلند کر کے رونا شروع کر دیا..

فرزانہ نے مسکرا کر کندھے جھٹکے.. کہ میں نہ کہتی تھی.. اور اُسے اُٹھا کر انکل جی کی گود میں ڈال دیا..

خاور نے اُسے بہلانے پرچانے کے تمام آزمودہ طریقے آزمائے.. پیٹھ پر تھپکیاں دیں... اُس کے اُسترا شدہ سر پر پیار سے ہاتھ پھیرے.. بہتیرا لچ لچ کیا... بازوؤں میں جھلایا لیکن مومن کا واشدہ منہ بند نہ ہوا..

اور واقعی اُس کے رونے کی والیوم اتنی بلند اور بے مہابہ تھی کہ جہاز میں سوار تمام مسافر اُس کی مسلسل ہوں آں ہو آں سے متاثر ہونے لگے..

"اِس باسٹرڈ کو واپس کرو..." وہ اُس کے کان کے قریب منہ لا کر ایک ناگن کی طرح سرسراتی آواز میں غصے سے بولی..

"شٹ اپ..." اُس نے آہستہ سے دانت بھینچتے ہوئے کہا..

بہت آہستہ سے اُس نے یہ کہا لیکن فرزانہ کے عورتی نظام نے اس آہستگی کو دوچند کر کے اُس تک پہنچا دیا...

"مومن کو مجھے دے دیں انکل جی..."

"نہیں... اسے مجھے دے دو... آئی لو چلڈرن.." اُس نے فرزانہ کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو پرے کیا اور خاور کی گود میں سے مومن کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پچکارنے لگی.. "کم آن بے بی سویٹ... مائی کیوٹ لٹل بے بی.. آئی ول سنگ یو اے لابائی.. چپ میرے سویٹ..." خاور دہشت زدہ ہو کر اُسے دیکھتا رہا.. اُس سے کچھ بعید نہ تھا.. وہ اس بچے کا گلا بھی گھونٹ سکتی تھی.. مومن کا منہ بند نہیں ہو رہا تھا..

وہ اپنی ناتواں آواز میں زمین سے جدا ہو کر کم آکسیجن والے ماحول سے مفاہمت نہیں کر پا رہا تھا.. اُس کے پھیپھڑے متحمل نہیں ہو رہے تھے اور وہ روتا چلا جا رہا تھا..

تب اُس نے نہایت آہستگی سے اور ملامت سے صرف ایک لفظ کہا "چپ..." اور وُہ چپ ہو گیا۔ اُس شیطان کے سینے سے پھوٹتی یا اُس لفظ "چپ" میں کوئی ایسی دھمکی تھی جو صرف اُس کا کچا وجود سمجھ سکتا تھا.. وہ بالکل چپ ہو گیا۔

"تھینک یو آنٹی.." فرزانہ نے انکل جی کو بائی پاس کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اپنے مومن کو وصول کیا لیکن اُس کے دمکتے ہوئے الہڑ نوخیز چہرے پر پہلی بار ڈر کی ایک دراڑ آئی.. "تھینک یو"۔

وہ دم روکے شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان دم روکے... کمر بالکل سیدھی رکھے چوکنا سا ہو کر بیٹھا رہا کہ اب دیکھئے کدھر سے وار آتا ہے.. اور جہاز اپنی مطلوبہ بلندی حاصل کر کے ایک ہلکی گونج کے ساتھ ساکت ہو چکا ہوتا محسوس ہوتا پرواز میں تھا.. شیطان جیسے اُس کی موجودگی سے بے نیاز کھڑکی کے دبیز بیضوی شیشے سے ناک چپکائے باہر دیکھنے میں مگن تھا.. اور سمندر اپنے بچے کو باہوں کے حصار میں لئے اُس پر جھکا تھا..

خاور نے پہلی بار پورا سانس لیا جس میں اطمینان تو تھا لیکن احتیاط زیادہ تھی... اُسکے ماتھے پر ایئر کنڈیشننگ کا چنداں اثر نہ ہوا تھا اور وہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا.. اُس نے نیپکن کو ماتھے پر رکھ کر پسینے کے جذب ہونے کا انتظار کیا.. لیکن اُس کے سوتے خشک نہ ہوتے تھے کیونکہ باہر

کے اطمینان نے ابھی اُس کے ڈرے ہوئے اندر تک رسائی حاصل نہیں کی تھی... سر کے عین اوپر سروس لائٹ کے بٹن اور ریڈنگ لائٹ کے درمیان میں سے ایک گول بنسری کے منہ ایسے سوراخ میں سے خنک ہوا خارج ہو رہی تھی جو اُس کے بائیں کندھے پر پھونک مارتی بکھر رہی تھی.. اُس نے بایاں بازو اُٹھا کر اُس گول لاٹو کو دائیں بائیں گھما کر ہوا کا رُخ اپنے چہرے کی جانب موڑنے کی کوشش کی.. کبھی وہ بالکل بند ہو جاتا اور کبھی اُس کی ہوا کسی اور جانب نکل جاتی.. اور اُس لمحے اُس نے اپنے اُٹھے ہوئے بازو میں اُس جگہ جہاں سے وہ بال نہیں صاف کرتا تھا اور اُن میں آیا ہوا پسینہ اُس کی قمیض کو بھگوتا تھا وہاں ایک ناک کا لمس محسوس کیا.. اُس کا ہاتھ وہیں جامد رہا اُس ناب پر اور اُس نے گردن کو ہلکا سا بل دے کر بائیں طرف... کھڑکی کی طرف نگاہ کی.. وہ بالکل خالی تھی لیکن وہاں تک جو نظر جاتی تھی اُس کے راستے میں نفاست سے رنگے ہوئے بال کہیں کہیں اُس ہوا کے زور سے جو گول سوراخ میں سے خارج ہو کر اُس کی ہتھیلی پر پھیلتی بازو سے اُترتی نیچے آتی تھی اُس کے زور سے اُڑتے تھے اور اُن میں شیمپو کی تازگی کی مہک تھی اور اُن کے نیچے کہیں وہ ناک تھی جس کا لمس اُس کی بغل میں محسوس ہو رہا تھا اور ایک گرم ہواڑ کے دو بہاؤ اس ناک میں سے پھنکارتے ہوئے بہتے تھے..

اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اُس کی بغل میں اپنا چہرہ چھپائے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی.

وہ منجمد سا ہو گیا.. "یہ... یہ تم کیا کر رہی ہو؟" جتنی بھی آہستگی، سرگوشی اور مدھم پن اُس کی آواز میں آ سکتا تھا... جتنی بھی باگیں وہ کھینچ سکتا تھا اُن کے تقریباً چپ تناؤ میں اس نے کہا..

"اپنا ہاتھ نیچے نہ کرنا..." اُس کے بالوں میں سے ایک بجھی بجھی سسکی نما آواز آئی "پلیز.. تمہیں یہاں پسینہ آیا ہوا ہے.. اور اُس کی بُو... یو سمیل ونڈر فل... پلیز.."

باسکٹ بال کے ایک کھلاڑی کی طرح جو بازو اونچا کر کے گیند کو باسکٹ میں ڈالنے کو جاتا ہے تو اُس کی تصویر اُتر جاتی ہے.. وہ وہیں ساکت ہو جاتا ہے... بازو اُٹھائے اُسی حالت میں... اُس نے گردن موڑ کر اپنے سامنے دیکھا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے.. قطار اندر قطار سینکڑوں سر... اُن میں سے کچھ ابھی حرکت میں تھے اور باتیں کر رہے تھے لیکن بیشتر ہیڈ ریسٹ پر ڈھلکے غنودگی میں تھے... وہ دائیں طرف دیکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا.. یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ فرزانہ نے ایک بار بھی ادھر نہ دیکھا ہو اُس کے دیر تک اُٹھے ہوئے بازو اور اُس

میں گھسے ہوئے سر کا نوٹس نہ لیا ہو.. وہ اُس کی جانب نہیں دیکھ سکتا تھا.. سامنے دیکھتا رہا... اگر وہ اپنا بازو یکدم نیچے کرتا ہے تو اُس کا سر اُس کے سینے کے ساتھ آ لگے گا.. اُس کے نتھنوں کی گرم پھونکیں بغل میں پھیل کر پسلیوں کو سیڑھیاں بناتیں نیچے تک اثر کرتی تھیں اور وہ بے حجاب سا محسوس کرتا تھا..

وہ اپنے مومن میں مست تھی... کن انکھیوں سے بھی اُدھر نہیں تکتی تھی جدھر انکل جی ایک مجسمے کی طرح بازو اُٹھائے نہ اب اُس ناب کو گھماتے تھے اور نہ اُس پر سے انگلیاں ہٹاتے تھے اور کھڑکی کا بیضوی شیشہ بالکل خالی تھا اور اُس کے پار اُبلتے ہوئے بادل دھیرے دھیرے پیچھے رہتے جاتے تھے اور اُن کی جگہ کوئی نئی شکل ظاہر ہوتی چلی جاتی تھی.... شوُرلی یہ آنٹی انکل جی کے کسی دوست کی بیوی نہیں ہیں اور شوُرلی وہ بیمار ہیں ورنہ... یوں تو نہیں کرتے جو وہ کر رہی ہیں.. فرزانہ کا چہرہ شرمندگی سے پھٹنے لگا.. جیسے اُس نے انکل جی کے بیڈ روم میں جھانک لیا ہو.. لیکن وہ مومن میں مگن رہنے کی اداکاری کرتی رہی..

"پلیز ڈونٹ ڈو دِس..." وہ جتنی نرمی سے کہہ سکتا تھا اُس نے بیٹھی ہوئی آواز میں درخواست کی..

"اوکے.. تھینک یو.." وہ پیچھے ہو گئی اور خاور نے فوراً بازو نیچے کر کے اپنی گود میں سمیٹ لیا اور دوسرا ہاتھ اُس پر رکھ دیا..

اُس کی بغل میں ابھی تک گرم ہواڑ کی پھونکیں بکھرتی تھیں اور جہاں اُس کی ناک تھی وہاں اُس کی موجودگی کی ٹہر ثبت تھی..

وہ اگر کر سکتا تو واک آؤٹ کر جاتا.. ایمرجنسی ڈور کا ہینڈل گھما کر باہر کود جاتا.. وہ اتنا شرمسار تھا.. فرزانہ تو ابھی تک اپنے مومن میں مگن تھی مگر راہداری کے پار جو نشستیں تھیں اُن میں سے ایک کا مسافر اس کھیل کو اپنی نظر میں لا چکا تھا اور ایک پیپنگ ٹام کی طرح اُن دونوں کو کن انکھیوں سے دیکھتا تھا....

وہ کیا سوچتا ہو گا.. ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے سے نسبتاً کم عمر ایک خاتون کے ساتھ یوں کھلے عام اٹکھیلیاں کر رہا ہے.. یہ اپنی عمر نہیں دیکھتا اپنے سفید بالوں کا کچھ قیاس نہیں کرتا... اس کی طبع ابھی تک حرص سے باز نہیں آئی...

اُس نے کبھی بھی اپنے آپ کو اس قدر نادانی کے اشتباہ میں نہیں ڈالا تھا.. کیونکہ اُس

کے مشاغل کبھی بھی ایسے نہیں رہے تھے جن میں اس نوعیت کی صورت حال میں گھر جانے کا امکان ہو.. اُس نے ایک ستھری اور معاشرتی طور پر بے عیب زندگی گزاری تھی.. وہ جنسی مقاصد کے حصول کے لئے ڈھیٹ نہیں ہوا تھا.. اُس کے ایسے جاننے والے بھی تھے جو جوانی کے ایام میں.. اور کچھ اُس کے ڈھلنے کے بعد بھی... کوئی دیوار پھاند کر کسی ترغیب تک پہنچنے کی کوشش میں پکڑے گئے اور خوار ہوئے... سینما ہال کے کسی بوکس میں مشغولیت کے عالم میں دھرے گئے... کسی گھر کے اندر گئے تو بیوی کی بجائے اُس کے خاوند کو منتظر پایا... اور وہ ان رومانوی مہم جوئی کے قصوں کو بغیر کسی شرم کے فخر سے بیان کرتے تھے لیکن اُس کا دل اس خیال سے ہی ڈوب جاتا تھا اُسے اپنے بدن کی لرزش پر اختیار نہیں رہتا تھا جب وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو کیا ہوتا..

اُس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ نادانی کا یہ اشتباہ.. عمر کے اس حصے میں ایک پرواز کے دوران.. اُسکے بہترین دوست کی بیٹی کے سامنے یوں مشتہر ہو گا..

اُس کا خیال تھا کہ یہ انتہا تھی..

"لیک آف یور شوز..." وہ پھر اُس کے کان کے قریب ہوئی..

"کیا.." اُس نے چونک کر کہا..

راہداری کے پار وہ پیپنگ ٹام اُن پر نظر رکھے ہوئے تھا اگرچہ فرزانہ انکل جی کے ان ایکسپلائٹس پر حیران تھی.. وہ اس ٹائپ کے تو نہ تھے.. اور میں ہمیشہ بہت اصرار کرتی تھی کہ انکل جی آپ دوبارہ شادی کیوں نہیں کر لیتے.. اس لئے وہ تھوڑی سی مطمئن اور خوش بھی تھی کہ بالآخر اُن کا رجحان ہو گیا ہے.. آنٹی دیکھنے میں بری نہیں ہیں اگر یہ غیر شادی شدہ ہیں تو..

"تم اپنے شوز اُتار دو ناں.." اور اس فقرے کی ادائیگی میں نہ وہ فاتر العقل تھی اور نہ ہی اُس پر حکم چلاتی تھی بلکہ ایک باندی کی طرح لجاجت سے اور مؤدب ہو کر درخواست کرتی تھی کہ..

"لیکن کیوں؟"

"پلیز..."

بحث کرنے کی گنجائش نہیں تھی.. بحث کے لئے بولنا پڑتا ہے اور وہ نہیں بولنا چاہتا تھا.. چپ رہنا چاہتا تھا.. یہ ایک ایسی ضد تھی جس کا جواز سمجھ میں نہ آتا تھا.. لیکن اس

میں حرج بھی نہ تھا.. خاور نے دائیں پاؤں سے بائیں پاؤں کے مکیشن کو نیچے دیکھے بغیر ایڑھی سے نیچے کر کے اُتار دیا..

اُس کا ننگا پاؤں آگے آیا اور اُس کی جراب کو ٹٹولتا اُسے اپنے انگوٹھے اور بڑھے ہوئے ناخنوں والی اُنگلیوں سے کھرچتا اُس کے تلوے تک چلا گیا..

خاور دم بخود سامنے دیکھتا رہا..

اُس کے ننگے تلوے اُس کے پاؤں کے اُبھار کو آہستہ آہستہ چھوتے رہے..

"جراب بھی اُتار دو... پلیز.." ایک پھنکار ایسی سرگوشی میں اُس نے ایک اور درخواست کی.. اور اس میں بھی ایک باندی کی عاجزی اور منت تھی..

"نہیں..."

"پلیز.."

"نہیں..."

"اگر تم جراب نہیں اُتارو گے تو آئی پرامس یو.. کہ میں شور مچادوں گی.. کہ یہ شخص مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہا ہے.." وہ ایک باندی سے ایک مالک میں بدل گئی

"تو پھر تم کیا کرو گے.."

اُس سے کچھ بھی بعید نہ تھا.. وہ یہ بھی کر سکتی تھی..

اُس کی طبیعت کا یہ پہلو پہلی بار سامنے آرہا تھا.. زیرو پوائنٹ کی بلندی پر وہ ہمیشہ اُس کا کہا مانتی تھی..

وہ اُس کوٹھڑی میں تھا جس میں اُس نے اُسے قید کر رکھا تھا... اُسے کچھ پرواہ نہ تھی کہ اس کوٹھڑی میں کچھ مسافر بھی ہیں.. اُس کے قریبی دوست کی بیٹی بھی ہے اور وہ کچھ لوگوں کی نظروں میں بھی ہیں..

"جراب اتار دو... پلیز.." اُس کی آواز میں ایک مستی تھی جس کے آگے انکار کا بند نہیں باندھا جا سکتا تھا..

خاور نے جھک کر.. انگوٹھے سے اڑس کر جراب نیچے کی اور اُتار دی.. جیسے ایک طوائف گاہک کے حکم پر کپڑے اُتارتی ہے..

اُس کا پاؤں... ایک ملاپ کی گرمی میں آئے ہوئے مست سانپ کی مانند رینگتا

ہوا اُس کے ننگے پاؤں پر آیا اور اُس کے لبوں سے آسودگی کی ایک سسکی... بھنچے ہوئے لبوں سے.. نکلی.. اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور اُس کی غلافی آنکھیں بند ہونے لگیں

"تھینک یو"

بلی کے سامنے آئے ہوئے ایک ششدر کبوتر کی طرح... حواس باختہ' منجمد اور ساکت.. سناٹے میں آیا ہوا شرمندگی اور بے بسی میں آیا ہوا وہ سامنے دیکھتا رہا..

"تھینک یو.." اُس نے پھر کہا "تم اپنی جراب پہن سکتے ہو"

اُس میں شدید غصے کا مادہ بہت کم تھا.. صرف چند بوندیں تھیں.. جو برسوں بعد برستی تھیں اور وہ بھی اکا دکا.. لیکن لینڈ کرنے کے بعد.. جہاز سے اُترتے ہوئے' لاؤنج کی جانب ٹرمیک پر چلتے ہوئے جب فرزانہ بہت پیچھے رہ گئی تھی اور وہ اُس کے برابر میں اُس کے بدن کو مس کرتی دھکیلتی چلی آ رہی تھی یہ چند بوندیں سیلاب ہو گئیں "تم ایک شرمناک عورت ہو.. میں آج کے بعد کبھی بھی تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا.."

"آئی ایم سوری..." وہ چلتے ہوئے اُس کے ساتھ لپٹتی گئی..

"کبھی نہیں.. یہ میرا وعدہ ہے.."

"مجھے معاف کر دو.." اُس کے بدن کی اُنگلیوں کی لرزش اُس کے قابو میں نہ آتی تھی اور وہ روتی چلی جاتی تھی.. "پلیز پلیز.. ڈونٹ ڈو دِس ٹو می.. میں ابھی تمہارے پاؤں پڑ جاتی ہوں.."

اور وہ جھکی لیکن وہ آگے نکل گیا..

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں.." وہ بھاگتی ہوئی اُس کے برابر میں آ گئی" آئی سویئر... مجھے پتہ نہیں تھا.. آئی ایم میڈ.. تمہیں پتہ ہے میں پاگل ہوں.. پلیز.."

"کبھی نہیں..."

ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی نہ اُس نے فرزانہ کی جانب دیکھا اور نہ اُسے دیکھا اور کھولتا ہوا پارکنگ لاٹ میں منتظر ایڈورٹائزنگ کمپنی کی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا..

بارہ کہو کے گھر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتے بجتے گھگھیا جاتی.. وہ چونگا اُٹھاتا اور اُس کی

پہلی سسکی سن کر واپس رکھ دیتا..

کبھی اُدھر سے بالکل خاموش ہوتی تو وہ بار بار ہیلو کہہ کر پوچھتا "کون؟"

"پاگل خانہ.." اُدھر سے جواب آتا اور وہ فوراً فون بند کر دیتا..

اُس کے مونگیا رنگ کے گیٹ کے پہلو میں ستون پر نصب پلاسٹک کی بیل بھی اُس کے ہاتھ سے دبتی رہتی.. اور ہدایت کے مطابق بشیر گیلے رخساروں اور بڑی بڑی آنکھوں والی روتی ہوئی بیگم صاحبہ سے کہہ دیتا کہ صاحب تو گھر پر موجود نہیں.. حالانکہ اُس کی کار پورچ میں کھڑی نظر آجاتی تھی..

یہ سلسلہ بہت دنوں تک.. کئی مہینوں تک جاری رہا.. اور پھر یکلخت بند ہو گیا..

کچھ عرصہ مکمل خاموشی رہی اور پھر وہ کبھی کبھار فون کر کے صرف یہ کہتی "پلیز فارگوی" اور پھر بند کر دیتی۔

کونج دشت ویران تھا..

سرسوتی کی مانند خشک ہو چکا تھا..

لیکن سرسوتی کی پاروشنی اب پکھی کے رُوپ ڈھنگ میں سندھ کے کناروں پر آکر بس چکی تھی اور اپنا جھگا نیچے نہیں کرتی تھی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ابھی تک سالم ہے' ہزاروں برس گزرنے کے باوجود اُس کی ایک چھاتی دلورائے کے کھنڈروں میں سے ظاہر ہونے والی مورتی کی مانند اکھڑی نہیں ابھی تک قائم ہے اور شائد اُسی بچے کو دودھ پلاتی ہے جو سرسوتی کی خشک ریت پر پیاس سے سکڑتے بدنوں کے ملاپ کا ثمر ہے..

وہ سومرو کے بیج سے پھوٹنے والے بہاؤ کا تسلسل ہے..

سرسوتی خشک ہو چکا تھا..

اور سندھ نے بھی خشک ہو جانا تھا..

کونج دشت اگرچہ ویران تھا لیکن اُس کے نام کی لاج رکھنے کو وہاں ایک غلافی آنکھوں والی کونج ابھی تک کُرلاتی تھی..

کوہ سلیمان کے سیاہی میں ڈوبتے سلسلوں کے سائے میں کونج دشت کے وسیع و عریض سناٹے میں صرف ایک کُونج تھی جو کرلاتی تھی... اپنے دیس کا کچھ پتہ نہیں دیتی تھی کہ کہاں سے آئی ہے.. اُس کا آبائی گھونسلا کس جھیل کے سروٹوں میں ہے اور وہ اُس میں اپنے بچے چھوڑ کر اس دشت تنہائی میں کیوں اُتر آئی ہے.. صرف اُس کی 'خاور کی متلاشی کیوں ہے.. ایک ایسے پرندے کے لئے گھربار چھوڑ کر کیوں آگئی ہے جس کے پر جھڑنے کو ہیں' رنگ مدھم ہو رہے ہیں' چونچ ڈھیلی ہو رہی ہے' آنکھیں مدھم پڑتی ہیں' اگرچہ وہ اپنے غیر قانونی

گھونسلے میں اکیلا ہے لیکن اُس کو رفاقت کی خواہش نہیں.. محبت سے آشنا نہیں.. اُس کے لئے وہ اپنا گھونسلا چھوڑ کر کیوں آگئی ہے.. اُس کی غلافی آنکھیں کیوں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں. کیوں اتنا روتی ہے کہ وہ جہاں بھی تھوڑی دیر ٹھہرتی ہے وہاں اُس کے آس پاس پانیوں کے گرنے سے دشت میں گھاس پھوٹنے لگتی ہے.. ایسا کراس ورڈ پزل کیوں ہے جس کے کسی خانے میں کوئی سراغ نہیں جو اُس کی بھید بھری مسافت کا کوئی اتہ پتہ دے کہ وہ کن راستوں سے ہوتی ہوئی اور کیسے کیسے موسموں میں پرواز کرتی بالآخر اس دشت میں پہنچی... راستے میں اُس نے پانیوں کے کن ذخیروں کے کناروں پر اپنے پر سمیٹ کر قیام کیا.. کیسے کیسے ویرانوں میں راتیں بسر کیں یا وہ مسلسل اُڑان میں رہی.. اُس کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی اور اُس کا نام کیا تھا.. اور اب پھر سنائے میں چلی گئی ہے..

وہ اُسے.. اُس بے نام مسافت کو مس کرتا تھا..

وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا وہ ابھی تک اُس کوٹھڑی میں ہے یا اُس سے باہر آچکا ہے جس میں وہ اسے مقفل کر کے چلی جاتی تھی اور پھر حسب آرزو آتی تھی' یہ قفل کھولتی تھی اور اُسے دیکھ لیتی تھی.. وہ اس کوٹھڑی کو بارہ کہو کی پہاڑیوں کے اوپر اپنے زیرو پوائنٹ پر لے جاتی تھی..

وہ اُس کی غیر حاضری کو محسوس کرتا تھا..

اس تہیے کے باوجود کہ اُس نے جواب میں کچھ نہیں کہنا اُس کے اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی خواہش موجود تھی..

اُس کی کوٹھڑی کی قید اُسے الجھن میں اور ناگواری میں مبتلا تو رکھتی تھی لیکن زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنے آس پاس ایک ایسی نامعلوم سی حدت محسوس کی جس کے وجود سے وہ سراسر ناآشنا تھا.. برف کا تودہ ایک گلیشیر اپنی منجمد ذات کو کائنات کے جماؤ کا ایک حصہ ایک حتمی اور آخری سچ سمجھتا ہے اور اُس انجماد میں مطمئن ہوتا ہے.. اور اس کو اپنے وجود کا جواز سمجھتا ہے اور تب تک سمجھتا رہتا ہے جب تک کہ اُس کے یخ بستہ بدن پر سورج کی کوئی ایک ایسی شعاع جو روزمرہ کی بے حدت کرنوں سے الگ اپنے اندر ایک جدا تپش رکھتی ہے اس پر پڑتی ہے اور یہ خبر کرتی ہے کہ کائنات صرف انجماد کا نام ہی نہیں اُسے پگھلانے کے بھی کچھ سلسلے ہیں.. اور وہی تپش سے سلگتی شعاع اُس گلیشیر کے سدا سے یخ بستہ وجود پر اثر کرتی ہے.. پگھلا کر پہلی بوند کو جنم دیتی ہے اور تب اُس کی منجمد ابدی تنہائی اُس ایک بوند کے

گرنے سے ٹوٹی ہے اور اُسے عرفان ہوتا ہے کہ جماؤ تا ابد نہیں ہوتا.. میں جو ہوں وہ لکھا نہیں گیا کہ ہمیشہ کے لئے ہوں.. میں تبدیل بھی ہو سکتا ہوں..

غلافی آنکھیں ایک ایسی ہی شعاع تھی.. ایک ایسی ہی کرن تھی..

وہ اُس کونج کی کُرلاہٹ اور غلافی آنکھوں کے سنہری پن کو دھونے والے پانیوں کے باوجود بے اثر رہا تھا.. اُس کے لئے کچھ بھی محسوس نہیں کرتا تھا لیکن شعاع کو.. ایک کرن کو یہ پرواہ نہیں ہوتی.. حساب کتاب کر کے کسی طے شدہ منصوبے کے مطابق متوقع نتیجے کے لالچ میں وُہ نہیں اُترتی کہ گلیشیر کے احساسات کیا ہوں گے کیونکہ وہ صرف اپنی حدت کے ہاتھوں بے بس ہو کر اُس پر پڑتی ہے اور اُسے صرف اتنا پگھلا سکتی ہے کہ ایک بوند ٹپکے' اُس کا جمود ٹوٹے اور اُس کی پچھلی تمام حیات کو منفی کر کے اُسے ایک مختلف رُوپ عطا کر دے..

اُس پاگل خانے نے اُسے اپنی من پسند مرضی کی قید میں مقفل تو کر رکھا تھا لیکن اُس کوٹھڑی کے اندر خاور کی منجمد حیات میں پہلی بار ایک کرن داخل ہوئی تھی جس کی اَن چاہی حدت نے اُسے پگھلا دیا تھا.. ایک بوند کے جنم لینے سے ایک گلیشیر وہ نہیں رہتا جو کہ ابد سے وہ تھا.. اور وہ بھی وہ نہ رہا.. جو کہ وہ تھا..

اور اس تبدیلی نے اسے آزردہ اور نا آسودہ کر دیا تھا.. یہ نہیں کہ وہ ابد تک منجمد رہنا چاہتا تھا.. انجماد کا تسلسل اُس کا ذاتی چناؤ تو نہ تھا.. وہ تو آگاہ ہی نہیں تھا کہ حیاتی کے طور طریقے اس سے الگ بھی ممکن ہیں.. آزردگی اور نا آسودگی کا سبب اور تھا.. ایک تاؤ تھا ایک طیش تھا جو اُسے نڈھال کرتا تھا کہ میں جو اس حدت سے ناواقف اور بے خبر تھا اور اپنی لاعلمی میں مطمئن تھا تو اس کرن نے میری برفوں میں سے.. اب جا کر... اتنی مدتوں بعد.. ایک بوند پگھلا کر میری شناخت کے رنگوں کو کیوں بدل دیا ہے.. اب جا کر... عمر کے اِس حصے میں.. قربت مرگ میں.. یہ پہلے کیوں نہیں اُتری.. اب جا کر اُتری ہے جب میں منزل پر پہنچنے کو ہوں.. سفر کے آغاز پر جب یہ مجھے گرما سکتی تھی.. میرے تن بدن کو حرارت دے سکتی تھی' مسافت میں معاون ثابت ہو سکتی تھی تب تو یہ نہیں اُتری.. اور اب جا کر.. جب پیچھا بہت دور رہ گیا تھا اور آگا نزدیک آ رہا تھا تو یہ اُتری ہے تو اس کی حدت کا.. پہلی بوند کا کیا فائدہ... میں نے جہاں جانا تھا وہاں پہنچنے کو ہوں تو یہ اب کیوں اُتری ہے..

یہی طیش تھا اور یہی غصہ تھا..

پھر بھی وہ اُس کی غیر حاضری اور فون کے سناٹے کو محسوس کرتا تھا..

ایک سیاہ فام کیپٹن اہاب کی مانند ماماں جعفر اپنی ٹانگ پر ہتھیلی جمائے سندھ کے پانیوں کو اپنی مہین اور کالی بھور آنکھوں سے چھانتا تھا اور اُس سفید وہیل موبی ڈک کی تلاش میں تھا جو اُس کی دوسری ٹانگ چبا کر روپوش ہو گئی تھی..

پکھی نے اپنا گھونسلہ نیچے کر لیا تھا...

کونج دشت میں کرلاتی ہوئی اکیلی کونج کوچ کر چکی تھی.. ریت پر اُس کے پنجوں کے نشان بھی باقی نہ تھے جن سے اُس کا کچھ سراغ مل سکتا.. کوئی نام' کوئی فون نمبر' اتہ پتہ نہ تھا.. وہ جیسے نمودار ہوئی تھی بغیر اطلاع کے ویسے ہی روپوش ہو گئی تھی..

اوڈیسیس کی کشتی آرگوس کی طرح سرور اور ماماں جعفر کی یہ کشتی نہ کسی سنہری کھال کی تلاش میں سرگرداں تھی اور نہ اس کے سفر کے دوران پانیوں میں سے' وہ نادیدہ اور سحر خیز جزیرے اُبھرتے تھے جہاں سے سائرنز کے گیت لہروں پر سفر کرتے کشتی کو کھینچنے والے ملاحوں کے کانوں میں اُتر کر اُنہیں بے خود اور بے اختیار کرتے تھے اور وہ کشتی کو چھوڑ کر سمندروں میں تیرتے حسن کے اُس فریب سے ہم آغوشی کی چاہت میں اپنی مرگ کو گلے لگاتے تھے..

اِسی لئے ملاحوں کے کانوں میں روئی ٹھونس دی گئی تھی کہ وہ اُن کے گیت نہ سن پائیں..

اوڈیسیس نے بھی اپنے آپ کو ایک مستول سے باندھ لیا تھا.. کانوں میں روئی نہیں ٹھونسی تھی کیونکہ وہ سحر طراز سائرنز کے گیت سننا چاہتا تھا..

اور جب اُس نے سائرنز کے گیت سنے تو وہ بھی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ مرگ بلاوے ہیں ایک وحشی جانور کی طرح رسّے تڑانے لگا.. ملاحوں کی منت سماجت کرنے لگا کہ مجھے کھول دو..

ملاحوں کے کانوں میں روئی بھری ہوئی تھی اور اوڈیسیس نے اُنہیں سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ مستول کے ساتھ جکڑنے کے بعد وہ چاہے کتنی ہی آہ وزاری کیوں نہ کرے.. دیوتاؤں کی کتنی ہی قسمیں کیوں نہ کھائے اُسے نہیں کھولنا.. اُس کے ساتھی اُسے سن نہیں سکتے تھے.. صرف چہرے سے اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ آزاد ہونا چاہتا ہے لیکن اُس کے حکم کے مطابق اُنہوں نے اُسے بندھا رہنے دیا.. اور وہ سحر طراز جزیروں کی گرفت سے بچ نکلے..

خاور بھی ایک ایسے ہی مستول سے بندھا ہوا تھا..

کشتی کشش کے جزیروں کی قربت میں سے گزرتی تھی..
یہ وہ کشش نہ تھی جو ایک نیلے سویٹر کی غیر موجودگی کے باعث وجود میں آتی ہے..
ایک بہانہ بنتی ہے..
ایک طعنہ بنتی ہے کہ تم مرزا صاحب جیسے نہیں ہو..
یہ کچھ اور تھا..
پکھی ایک سائرن کا روپ دھار رہی تھی..

اُسے دیکھ کر وہ بھی ایک سومرو میں بدلتا تھا جو ہزاروں برس پیشتر سرسوتی کی شادابی کے زمانوں میں مہریں اور منکے بناتا تھا.. جس نے ایک شام پہلی بار یہ دیکھا تھا کہ سرسوتی کے پانی ایک کچھوے کی پشت کو نہیں ڈھانپ رہے وہ کناروں سے سمٹتے جاتے ہیں اور کم ہو رہے ہیں اور یہ بستی ویران ہونے کو ہے.. ایک مشاہد علی سے دوچار تھا.. جو راوی کے پانیوں کے اُترنے اور کامران کی بارہ دری کی اُن اینٹوں کے ننگے ہونے کا گواہ تھا جو پہلے زیر آب آتی تھیں..

وہ اُنہی کا ایک تسلسل تھا لیکن اس تسلسل سے آگاہ نہیں تھا..
جیسا کہ پکھی بھی آگاہ نہیں تھی کہ وہ پاروشنی کی ایک مورت ہے..
اسی لئے پکھی کی کشش اُس میں گئے زمانوں سے بہتی ہوئی اُس کے وجود سے آ لگی تھی..
غلافی آنکھیں اس موجود لمحے میں جو حیات تھی اُس کی کرن تھیں.. ایک عارضی بندوبست تھیں.. وہ صدیوں کے بہاؤ میں کاغذ کی ایک کشتی تھیں.. جب کہ پکھی سدا سے بہاؤ میں تھی اور بہتی ہوئی اُس کے وجود کے کنارے سے آ لگی تھی..

اور یہ پاروشنی... جو کہ اپنے پاروشنی ہونے سے آگاہ نہیں تھی.. اُس کا رکھوالا.. اُس کا درچن.. جو لمحۂ موجود میں سرور تھا.. رواں کشتی کے پچھلے حصے میں دھوپ کی گرمائش میں بے سُدھ سوتا تھا' ایک سیاہ اکڑی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا.... اور جب ماماں جعفر نے پلٹ کر ایک "ہوئے سرور ہوئے" کی پکار کی تو وہ نہ کسمسایا اور نہ اُس نے ذرا کروٹیں بدل کر کسل مندی سے آنکھیں ملیں بلکہ فوراً یوں ہوشیار ہو کر اُٹھ بیٹھا جیسے کبھی سوتا ہی نہ تھا "ہوئے ماماں.." اُس نے جواب میں کہا

"ڈھی چو... نیچے سے لگ رہی ہے.. رسّہ پکڑو"

سرور فوراً با عمل ہو گیا.. کشتی کی ناک میں جکڑے ہوئے رسّے کو کھولا.. اور اُس کا

سرا پکڑ کر پانی میں کود گیا.. وہ رسے کو کندھے پر رکھے کنارے پر پہنچا اور پھر جھک کر زور لگاتا ہوا کشتی کو کھینچنے لگا..

رسہ تنا ہوا.. کشتی کی ناک سے بندھا ہوا.. اور اُس کے آخری سرے پر کنارے کی ریت میں سے اپنے چپو پاؤں آسانی سے نکالتا ہوا جھکا زور لگاتا سرور..

ماماں جعفر نے کچھ دیر تحمل سے کام لیا..

لیکن کشتی اب بھی تہہ سے لگتی اٹکتی تھی..

"یہ دھی چو... پہلے تو کبھی ان پانیوں میں آکر نیچے سے نہیں لگتی تھی.. آج اس دھی چو کو کیا ہو گیا ہے.." وہ بڑبڑاتا رہا.. "اس رت میں پانی بہت ہوتا ہے.. آج کیا ہو گیا ہے.."

وہ خاور کی موجودگی سے قطعی طور پر لاتعلق ہو چکا تھا اور اب اس کی پوری حیاتی کا واحد مسئلہ اس اٹکی ہوئی کشتی کو ریتلی تہہ میں سے نکالنا تھا..

اور یہ سرور کے زور لگاتے سیاہ جسے میں سے اُبھرتی... پھٹنے کو آتی رگوں اور اُس کے دوہرے ہوتے جاتے جانور بدن کے بس میں نہ تھا..

ماماں جعفر بھی پانی میں کود گیا اور کنارے پر پہنچ کر سرور کی پشت سے لگ کر رسے کو کھینچنے لگا..

پکھی بھی اُس کی موجودگی سے لاتعلق ہو چکی تھی... اُس کا رشتہ صرف اس کشتی کے ساتھ تھا جو اُس کا گھر تھی.. اگرچہ چند روز کے لئے وہ خاور کی عارضی ملکیت میں تھی... عارضی ملکیت کے ساتھ اُس کا رشتہ بھی عارضی تھا اور وہ صرف اُن دونوں کے لئے فکرمند تھی جو سندھ کے کناروں پر زور لگاتے جھکے ہوئے بدنوں کے ساتھ اُس کے گھر کو ریتلی تہہ کی دلدل میں سے نکالنے کی سعی کرتے تھے..

کشتی اُن کے مشترکہ زور سے آہستہ آہستہ کھسکنے لگی..

رواں ہونے لگی..

کنارا بلند ہونے لگا اور سرور اور ماماں کشتی کی ناک سے بندھے موٹے رسے کو کندھوں پر جمائے جھکے ہوئے اُس کنارے کے ساتھ بلند ہونے لگے.. یوں جیسے وہ ایک بے جان اژدھے کو کندھوں پر رکھے اُس کے بوجھ تلے جھکے زور لگاتے چلتے جا رہے ہوں...

کشتی اتنی آہستگی سے حرکت کرتی تھی کہ ساکن لگتی تھی لیکن نظر کنارے پر جاتی